اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۷)

ایمان

نظریہ حیات، اور مقصدِ حیات سے گذر کر اب ہمارے سامنے تیسرا سوال آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام نے انسانی سیرت کی تعمیر کس بنیاد پر کی ہے؟

سیرت اور اس کی ذہنی بنیاد انسان کے جملہ اعمال و افعال کا سرچشمہ اس کا ذہن ہے۔ مبدأ افعال ہونے کی حیثیت سے ذہن کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ اس میں کسی خاص قسم کے خیالات راسخ نہ ہوں، مختلف پراگندہ اور منتشر خیالات آتے رہیں، اور ان میں سے جو خیال بھی قوی ہو وہی عمل کے لئے محرک بن جائے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ وہ پراگندہ خیالی کی آماجگاہ نہ رہے، بلکہ چند مخصوص خیالات اس میں اس طرح راسخ ہو جائیں کہ اس کی عملی زندگی مستقل طور پر انہی کے زیر اثر ہو، اور اس سے منتشر اعمال سرزد ہونے کے بجائے مرتب و منضبط اعمال صادر ہوا کریں۔ پہلی حالت کو ہم ایک سڑک سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو ہر آیند و روند کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ کسی وارد و صادر کی اس میں تخصیص نہیں۔ اور دوسری حالت ایک ایسے سانچے کی سی ہے جس میں سے ہمیشہ ایک متعین شکل و ہیئت کے پرزے ڈھل کر نکلتے ہیں۔ جب انسان کا ذہن پہلی حالت میں ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی کوئی سیرت نہیں ہے۔ وہ شیطان بھی ہو سکتا ہے اور فرشتہ بھی۔ اس کی طبیعت میں تلون ہے۔ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے کب کس قسم کے فعل کا صدور ہو۔ بخلاف اس کے جب وہ دوسری حالت میں آجاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ اپنی ایک سیرت رکھتا ہے۔ اس کی عملی زندگی میں ایک نظم ہے۔ ایک ترتیب ہے۔ اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کن حالات میں کیا

فعل کرے گا۔

تنظیم عمل کی پہلی شرط پس معلوم ہوا کہ انسان کی عملی زندگی کا ایک قابل اعتماد نظم و ترتیب اختیار کرنا منحصر ہے اس پر کہ اس کی ایک مستقل سیرت بن جائے، اور سیرت کے بننے کا انحصار اس پر ہے کہ انسان کا ذہن پراگندہ خیالی کی حالت سے نکل جائے، چند مخصوص خیالات اس کے اندر متمکن ہو جائیں، اور ان خیالات میں اتنا رسوخ، اتنا جماؤ، اتنی مضبوطی ہو کہ کسی دوسری طرح کے خیالات کو آنے اور ذہن کی دنیا میں برہمی پیدا کرنے کا موقع نہ دیں یہ خیالات جتنے زیادہ گہرے جمے ہوئے ہوں گے، سیرت اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی اور انسان کی عملی زندگی اتنی ہی زیادہ مرتب، منظم اور قابل اعتماد ہوگی۔ برعکس اس کے ان میں جتنی کمزوری ہوگی، مخالف خیالات کو راہ دینے کی جتنی زیادہ صلاحیت ہوگی، اتنی ہی سیرت بھی کمزور ہوگی، اور عملی زندگی بھی اسی قدر بے نظم اور ناقابل وثوق ہو جائیگی۔

ایمان کے معنی قرآن کی اصطلاح میں انسانی سیرت کی اسی ذہنی بنیاد کا نام "ایمان" ہے ایمان کا لفظ مادہ "امن" سے نکلا ہے۔ امن کے اصلی معنی نفس کے مطمئن اور بے خوف ہو جانے کے ہیں۔ اسی سے امانت ہے جو ضد ہے خیانت کی۔ یعنے امانت وہ ہے جس میں خیانت کا خوف نہ ہو۔ امین کو امین اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی نیک معاملگی پر دل ٹھک جاتا ہے وثوق ہوتا ہے کہ وہ بد معاملگی نہ کرے گا۔ جو اونٹنی غریب اور مطیع ہوتی ہے اس کو اَمُون کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے سرکشی اور شرارت کا خوف نہیں ہوتا۔ اسی مادے کا باب افعال "ایمان" ہے اس سے مراد یہ ہے کہ نفس میں کوئی بات بر بنائے تصدیق و یقین اس طرح جم جائے کہ اب اس کے خلاف کسی بات کے راہ پانے اور داخل ہو جانے کا خوف ہی باقی نہ رہے۔ ایمان کا کمزور ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ نفس اس بات پر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا، قلب کو پوری طرح سکون نہیں ہوا۔ اس کے خلاف باتوں کو بھی ذہن میں داخل ہو جانے کا موقع مل گیا۔ اسی سے سیرت کمزور ہوئی۔ اور اسی نے عملی زندگی میں بے نظمی پیدا کر دی۔ ایمان کا قوی اور مضبوط ہونا اس کا عکس ہے مضبوط ایمان کے معنی یہ ہیں کہ سیرت بالکل ٹھوس

اور یقینی بنیادوں پر قائم ہوگئی۔ اب اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ اعمال ٹھیک اُس تخیل اور اُس مفکورہ کے مطابق و مناسب صادر ہوں گے جو دل میں جم گیا ہے۔ اور جس سے سیرت کا سانچہ طیار ہوا ہے۔

تہذیب کی تاسیس میں ایمان کا مرتبہ

اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقائد و افکار پر ایمان رکھتے ہوں، اور ان کی سیرتیں مختلف و متضاد بنیادوں پر قائم ہو جائیں تو کوئی اجتماعی حیثیت نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہوگی جیسے ایک میدان میں بہت سے پتھر بکھرے پڑے ہوں۔ ہر پتھر بلاشبہ اپنی جگہ مضبوط ہے، مگر ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے بخلاف اس کے اگر ایک ہی مشترک تخیل بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراک ایمانی کا رابطہ ان کو ایک قوم بنا دیگا۔ گویا وہی پتھر جو بکھرے پڑے تھے چونے سے جوڑ دیے گئے۔ اور ایک مضبوط دیوار قائم ہوگئی۔ اب ان کے درمیان تعامل اور تعاون شروع ہو جائیگا۔ جس سے ترقی کی رفتار تیز اور تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگی اور ان کے اعمال میں ایک رنگی پیدا کر دے گا۔ اس سے ایک خاص تمدن پیدا ہوگا، ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہوگی، ایک نئی قوم نئی سیرت نئی ذہنیت، نئے خیالات نئے طریق عمل کے ساتھ اٹھے گی اور اپنی حضریت کا قصر ایک نئے ہی انداز پر تعمیر کرے گی۔

اس تقریر سے آپ نے سمجھ لیا کہ ایک تہذیب میں اس اساسی تخیل کا کیا مرتبہ ہے جو اجتماعی طور پر اس تہذیب کے متبعین میں ایمان بن کر راسخ ہو جاتا ہے۔

ایمان کی دو قسمیں

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ایمان کے اعتبار سے دنیا کی مختلف تہذیبوں کا کیا حال ہے ایمان کا لفظ اصل میں تو ایک مذہبی اصطلاح ہے۔ مگر چونکہ یہاں ہم اس کو اساسی تخیل کے معنی میں بول رہے ہیں اس لئے اس معنی میں ایمان کی دو قسمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ ایک وہ ایمان جو مذہبی نوعیت رکھتا ہو۔ اور دوسرا وہ جو دنیوی نوعیت رکھتا ہو۔ مذہبی نوعیت کا ایمان صرف اس تہذیب کی اساس بن سکتا ہے۔ جس کی بنیاد مذہب پر ہو کیونکہ اس صورت میں ایک ہی ایمان دین اور دنیا دونوں پر حکمران ہوتا ہے مگر جس تہذیب کی بنیاد

مذہب پر نہ ہو جس میں دنیوی ایمان مذہبی ایمان سے الگ ہو جاتا ہے اور مذہبی ایمان کا شخصی و قومی زندگی پر کوئی اثر باقی نہیں رہتا

مذہبی ایمان مذہبی ایمان عموماً ایسے امور پر ہوتا ہے جو انسانی سیرت کو روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرتے ہیں، مثلاً ایک یا متعدد معبود جن کو مخصوص صفات سے متصف کیا گیا ہو کتابیں جن کا الہامی ہونا تسلیم کر لیا گیا ہو اور پیشوا جن کی تعلیم پر اعتقاد و عمل کی بنیاد رکھی گئی ہو۔ دینی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر خالص دنیوی نقطۂ نظر سے اس قسم کے ایمان کی کامیابی دو چیزوں پر منحصر ہے۔ ایک یہ کہ مذہب نے جن امور کی تصدیق کرنے اور جن پر یقین رکھنے کا مطالبہ کیا ہے وہ عقلی اعتبار سے قابل تصدیق ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ ایسے امور ہوں جن کی بنیاد پر انسانی سیرت کی تعمیر صحیح طور سے ہو سکتی ہو یعنی وہ سیرت کو اس طرح سے بنائیں کہ اس کی روحانیت، ایک اعلیٰ درجہ کے نظام اخلاق کی تاسیس کرنے والی ہو، اور اس کا اخلاق اپنی پاکیزگی و طہارت کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں بھی انسان کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے مستعد کرنے والا ہو۔

پہلی شرط اس لئے ضروری ہے کہ اگر ایمانیات محض اوہام کا مجموعہ ہوں، یا ان میں اوہام زیادہ اور معقولات کم ہوں، تو انسان کے ذہن پر ان کا استیلا، کلیۃً جہالت و نادانی کا زیر بار منت رہیگا جونہی کہ ارتقائے عقلی کے بلند مدارج کی طرف انسان نے قدم اٹھایا۔ اور بس اوہام باطلہ کا طلسم ٹوٹنا شروع ہو گیا ایمان کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ اور اس کے ساتھ ہی روحانیت اور اخلاق کا وہ سارا نظام بھی درہم برہم ہوتا چلا گیا جس پر شخصی اور قومی سیرت کی بنیادیں اٹھائی گئی تھیں۔ اس کی مثال میں ہم ان عقائد و افکار کو پیش کر سکتے ہیں جو مختلف مذاہب نے دیوتاؤں، معبودوں، خداؤں اور پیشواؤں کے متعلق پیش کئے ہیں۔ ان کو جن صفات سے متصف کیا گیا ہے، جو افعال ان کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، جو فسانے ان کے متعلق گھڑے گئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ عقل سلیم ان کی تصدیق کرنے اور ان پر ایمان لانے سے انکار کرتی ہے اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ ان پر اعتقاد رکھنے والی قوم دنیا میں ترقی اور غلبہ حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتی۔ باطل اوہام اس کے ذہن پر ایسا بڑا اثر ڈالتے ہیں کہ عمل کی بہترین قوتیں ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں۔ نہ حوصلوں

میں بلندی پیدا ہوتی ہے، نہ عزائم میں شدت، نہ نگاہ میں وسعت، نہ دماغ میں روشنی، نہ دل میں جرأت آخر کار یہی چیز اس قوم کے لئے دائمی نکبت، ذلت، مقہوری اور غلامی کا سبب بن جاتی ہے۔ برعکس اس کے جن قوموں پر کچھ دوسرے اسباب سے ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں وہ عقل و علم کے اعتبار سے جتنی ترقی کرتی جاتی ہیں اپنے خداؤں، معبودوں، اور پیشواؤں پر سے ان کا اعتقاد اٹھتا جاتا ہے۔ اول اول نظام اجتماعی کی حفاظت کے لئے ان غلط ایمانیات کو محض مصلحۃً برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے خلاف دل اور دماغ کی بغاوت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ آخر کار قوم کے ذہن پر ان کے لئے کوئی گرفت باقی نہیں رہتی۔ صرف ایک مختصر سا روحانی گروہ ان پر یقین رکھنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے، اور باقی ساری قوم کے نفس و روح پر ایک دوسرے ایمان کا تسلط ہو جاتا ہے جس کو ہم نے دنیوی ایمان سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری شرط کا ضروری ہونا بالکل ظاہر ہے۔ جو ایمانیات انسان کو دنیوی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے طیار نہیں کر سکتے ان کا اثر محض روحانی اور اخلاقی زندگی تک محدود رہتا ہے، مادی زندگی تک نہیں پہنچنے پاتا۔ نتائج کے اعتبار سے یہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو ان کی بدولت وہ قوم ترقی ہی نہ کرے گی جو ان کی معتقد ہوگی۔ یا ترقی کرے گی تو بہت جلدی ان کی گرفت سے نکل جائے گی۔ مذہب کا ایمان تہذیب کے ایمان کے لئے جگہ خالی کر دے گا، اور جب مادی زندگی کی سعی و عمل میں قوم کا انہماک بڑھے گا تو اخلاق و روحانیت بھی مذہبی ایمانیات کے اثر سے آزاد ہو جائیں گے۔

میں عمداً کسی مذہب کی تنقیص کرنی نہیں چاہتا۔ اس لئے تفصیل کے ساتھ مختلف مذاہب کے ایمانیات پر کوئی کلام نہ کروں گا۔ آپ مذاہب کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح بعض مذاہب کے ایمانیات نے ان کے معتقدین کو دنیوی زندگی میں ترقی کرنے سے روکا ہے اور کس طرح بعض مذاہب کے ایمانیات علم و عقل کی ترقی کا ساتھ نہ دے سکے؟ پھر یہ بھی آپ دیکھینگے کہ دوسری قوموں نے تنزل کی حالت میں اپنی مذہبی معتقدات پر ایمان رکھا اور ترقی کی حالت میں ان کو چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ایمان

میں سب سے زیادہ مضبوط اس وقت تھے جب وہ دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے، اور ان کے ایمان میں کمزوری آئی تو اس وقت جب کہ وہ عقل میں، علم میں، دنیوی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور دوسری قومیں ان پر غالب آ گئیں۔ آج مسلمان انتہائی تنزل کی حالت میں ہیں اور اس کے ساتھ ضعف ایمانی کے مرض میں بھی شدت کے ساتھ مبتلا ہیں۔ اب سے ہزار بارہ سو برس پہلے وہ انتہائی ترقی کی حالت میں تھے، اور اس کے ساتھ اپنے مذہبی ایمان میں انتہا درجہ کے مضبوط بھی تھے۔ بخلاف اس کے یورپ کے مسیحی اور جاپان کے بودھی جب پکے مسیحی اور بودھی تھے تو حد درجہ تنزل کی حالت میں تھے اور جب انہوں نے ترقی کی تو مسیحیت اور بودھیت پر ان کا ایمان نہ رہا۔ یہ اسلام کے ایمانیات اور دوسرے مذاہب کے ایمانیات کا ایسا نمایاں فرق ہے جس کو با دنیٰ تامل ہر صاحب عقل و بصیرت انسان محسوس کر سکتا ہے۔

دنیوی ایمان اب دوسری طرف ان ایمانیات پر نظر ڈالیے جن کو ہم دنیوی ایمانیات سے تعبیر کر رہے ہیں ان میں کوئی مذہبی عنصر شامل نہیں ہے۔ نہ یہاں کوئی خدا ہے، نہ کوئی مذہبی پیشوا نہ کوئی الہامی کتاب، نہ کوئی ایسی تعلیم جو انسانی سیرت کو روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرنے والی ہو۔ یہ خالص دنیوی امور ہیں

ان میں سب سے بڑی چیز "قوم" ہے۔ جسے ایک خاص رقبے کے رہنے والے لوگ معبود بنا کر پورے خلوص و انہماک کے ساتھ پوجتے ہیں، تمام "قوم پرست" اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ قوم ان کے جان و مال کی مالک ہے، اس کی خدمت و حفاظت فرض ہے، اس کی خدمت میں جان دینا اور اس پر تن من دھن نثار کر دینا عین سعادت ہے، اور یہی نہیں بلکہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ انہی کی قوم برحق ہے، وہی زمین کی وارث اور مستحق ہے، دنیا کی تمام زمینیں اور دنیا کی ساری قومیں اس کے لئے غنائم اور رعایا کی حیثیت رکھتی ہیں، ہر شخص کا فرض ہے کہ سارے جہان میں اپنی قوم کا علم بلند کرے۔

دوسرا معبود ملک کا "قانون" ہے جس کو وہ خود بناتے ہیں اور پھر خود ہی اس کی عبادت کرتے ہیں۔ یہی عبادت ان کے اجتماعی ضبط و نظم کی ضامن ہے،

تیسرا معبود ان کا اپنا "نفس" ہے جس کی پرورش، جس کی حاجات و ضروریات کی تکمیل، اور جس کے داعیات و خواہشات کی تحصیل ہر وقت ان کے پیش نظر رہتی ہے۔

چوتھا معبود "علم و حکمت" ہے جس پر وہ ایمان لاتے ہیں، جس کی روشنی میں چلتے ہیں، اور جس کی رہنمائی میں ترقی کی راہ پر گام زن ہوتے ہیں۔

یہ ایمانیات یقیناً دنیوی زندگی کے لئے ایک حد تک مفید ہیں مگر قطع نظر اس کے کہ حق اور صداقت کے اعتبار سے ان کا کیا مرتبہ ہے، خالص دنیوی نقطۂ نظر سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا فائدہ نہ حقیقی ہے، نہ پائدار۔ ان کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان میں کوئی روحانی و اخلاقی عنصر شامل نہیں ہوتا اسلئے مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹتے ہی اخلاقی مفاسد کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ قانون کا یہ منصب نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں حاسۂ اخلاقی پیدا کرے اور صحیح معنوں میں اخلاق کا کوئی معیار قائم کر دے۔ نہ اس میں اتنی قوت ہے کہ شخصی و اجتماعی زندگی میں اخلاق کی حفاظت کر سکے، اس کا اثر اور دائرۂ عمل بس محدود ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ وہ قانون جس کو لوگ خود بناتے ہیں، اس معاملہ میں اور بھی زیادہ بے وقع ہوا ہے۔ اس لئے کہ ایسے قانون کی گرفت کو تنگ اور ڈھیلا کرنا تو لوگوں کے اپنے اختیار میں ہے جتنی جتنی آزادیٔ عمل کی خواہش لوگوں میں بڑھتی جاتی ہے، پرانی اخلاقی بندشیں تنگ اور ناقابل برداشت محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اور جب کسی اخلاقی بندش کے متعلق یہ احساس عام ہو جاتا ہے، تو رائے عام کا دباؤ قانون کو اپنے بند ڈھیلے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اخلاق کے سارے بند کھل جاتے ہیں ایک عام اخلاقی انحطاط شروع ہو جاتا ہے اور اخلاقی انحطاط وہ چیز ہے جس کے مہلک اثرات کو نہ دولت کی فراوانی روک سکتی ہے، نہ حکومت کا زور، نہ مادی وسائل کی قوت، نہ علم و حکمت کی تدابیر۔ یہ ایک گھن ہے جو اندر سے لگنا شروع ہوتا ہے۔ اور مضبوط سے مضبوط عمارت کو اس کے تمام ساز و سامان سمیت لے بیٹھتا ہے۔

ان کے علاوہ قوم پرستی اور نفس پرستی کے جو دوسرے مفاسد ہیں وہ اتنے نمایاں ہیں کہ ان کے بیان میں کچھ زیادہ تفصیل کی حاجت نہیں ہے۔ اب تو ان کو سمجھنے کے لئے کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں

رہی وہ نظریات سے گذر کر محسوسات و مشاہدات کے درجہ میں آگئے ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آج انہی کی بدولت ایک بہت بڑی تہذیب ہلاکت و بربادی کے سرے پر پہنچ گئی ہے۔ اور وہ انہی کے نتائج ہیں جن کے یقینی ظہور کا اندیشہ آج تمام دنیا کو لرزہ براندام کیے ہوئے ہے

چند اصول کلیہ اس تمام بحث سے چند اصول کلیہ مستنبط ہوتے ہیں جن کو آیندہ مباحث کی طرف تجاوز کرنے سے پہلے ایک ترتیب صحیح کے ساتھ ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

(۱) انسانی اعمال کا منضبط اور منتظم ہونا، منحصر ہے اس پر کہ اس کی ایک مستقل اور متعین سیرت بن جائے۔ کسی مستقل سیرت کے بغیر انسان کی عملی زندگی پراگندہ، متلوّن، اور ناقابل وثوق رہتی ہے

(۲) سیرت کی بنیاد ان تصورات پر ہے جو ذہن میں پوری قوت کے ساتھ راسخ ہو جائیں، اور اتنا غلبہ حاصل کر لیں کہ انسان کی ساری عملی قوتیں انہیں کے زیر اثر رہ کر کام کرنے لگیں۔ اس رسوخ کا اصطلاحی نام "ایمان" ہے، اور اس طرح راسخ ہو جانے والے تصورات کو ہم "ایمانیات" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۳) سیرت کی اچھی اور بری صحیح اور غلط مضبوط اور کمزور تشکیل، کلیۃً انہی "ایمانیات" کی نوعیت اور ان کے رسوخ ایمانی پر منحصر ہے۔ ایمانیات صحیح ہوں تو سیرت بھی صحیح ہو گی، ایمان مضبوط ہو تو سیرت بھی مضبوط ہو گی۔ ورنہ معاملہ اس کے برعکس ہو گا۔ لہٰذا انسان کی زندگی کو ایک صحیح اور اعلیٰ درجہ کے نظم میں لانے کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کی سیرت کو ایک صحیح اور مضبوط ایمان پر قائم کیا جائے۔

(۴) جس طرح شخص واحد کے اعمال حیات کو پراگندگی سے نکال کر ضبط اور نظم کے تحت لانے کے لئے ایمان کی ضرورت ہے اسی طرح بہت سے اشخاص کو انتشار اور تفرقہ کی حالت سے نکال کر ایک منظم اور متحد جمعیت بنا دینے کے لئے ضروری ہے کہ ان سب کے دلوں میں ایک ہی مشترک ایمان بٹھا دیا جائے پس تمدن کا مفاد اس کا مقتضی ہے کہ ایمان کا معاملہ محض شخصی نہ رہے، بلکہ قومیت کا رشتہ اتحاد بن جائے

۵۔ جب ایک مشترک ایمان کے زیر اثر بہت سے افراد میں ایک مشترک قومی سیرت بن جاتی ہے، اور اس سیرت کے اثر سے ان کی زندگی کے اعمال میں ایک طرح کی یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے، تو ایک خاص طرز و انداز کی تہذیب وجود میں آتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر تہذیب کی تاسیس اور تشکیل میں ان ایمانیات کا بڑا دخل ہے جو قومی سیرت کو بناتے اور پختہ کرتے ہیں۔

(۶) جس قوم کے ایمانیات روحانی امور پر مشتمل ہوتے ہیں اس کا مذہب اور اس کی تہذیب دونوں ایک ہوتے ہیں، اور جس کے ایمانیات دنیوی امور پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کی تہذیب اس کے مذہب سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس دوسری صورت میں شخصی اور قومی زندگی پر مذہب کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

(۷) تہذیب کا مذہب سے آزاد ہو جانا آخر کار اخلاقی انحطاط اور تباہی کا موجب ہوتا ہے

(۸) تہذیب کا مذہب کے زیر اثر رہنا منحصر ہے اس پر کہ مذہب کے ایمانیات ایسے روحانی امور پر مشتمل ہوں جو ادنیٰ مدارج سے لیکر بلند ترین مدارج تک انسان کے ارتقائے عقلی کا ساتھ دے سکیں اور جن سے انسانی سیرت کی تشکیل اس طرح پر ہو کہ وہ بیک وقت اعلیٰ درجہ کا دیندار بھی ہو اور دنیا دار بھی، بلکہ اس کی دنیا داری عین دینداری ہو اور دین داری، عین دنیا داری۔

(۹) جس قوم کا مذہب و تہذیب دونوں ایک ہوں، اس کا ایمان نرا مذہبی ایمان ہی نہیں ہوتا بلکہ بعینہٖ دنیوی ایمان بھی ہوتا ہے۔ اس کے ایمان کا متزلزل ہونا اس کے مذہب اور اس کی تہذیب دونوں کے لئے غارت گر ہے، اس کی دنیا اور اس کے دین دونوں کے لئے تباہ کن ہے۔

یہی وہ اصول کلیہ ہیں جن کے لحاظ سے ہم کو ایمان کے متعلق اسلام کے موقف پر تنقیدی نگاہ ڈالنی ہے۔ (باقی)